
محمود نمبر
تاج

محمود نمبر

تاج

ماہنامہ
کراچی ۲

مدیر اعلیٰ
بابا ذہین شاہ تاجی

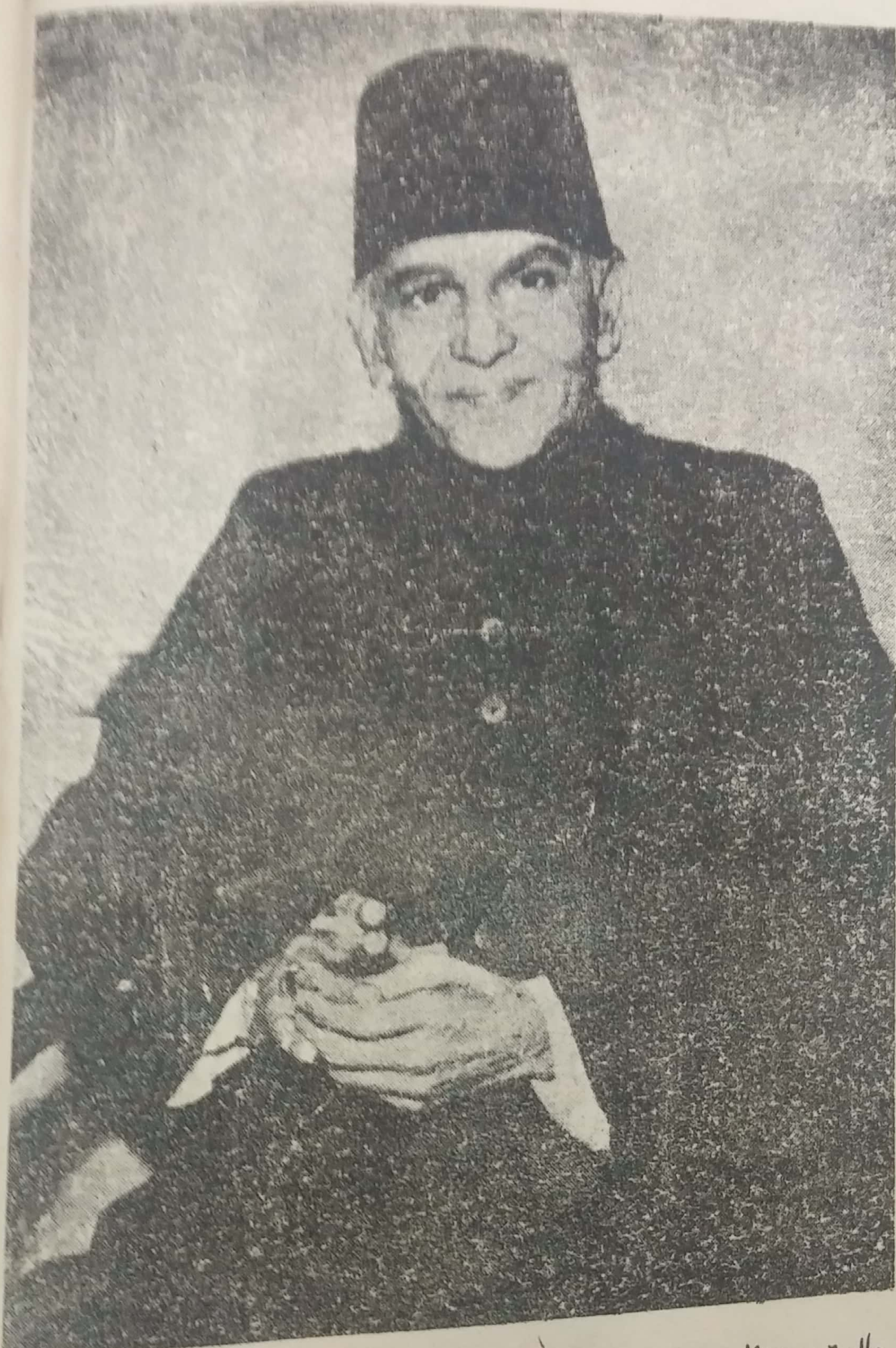
جلد ۱۲ شمارہ ۸

مقام اشاعت :
تاج منزل ،
بہار کالونی
ٹینری روڈ ،
کراچی ۲

زرِ سالانہ :
دس روپے

محمود نمبر فی کاپی
۳ روپے ۵۰ پیسے

مشہور آفسٹ پریس کراچی



ولادت :- ۱۵ر جنوری ۱۹۰۶ء (بہار) — وصال :- ۲ر ستمبر ۱۹۶۸ء (جدہ) — میٹرک ۱۹۲۲ء
ایم-اے ۱۹۲۹ء — وکالت :- ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۱ء — لیکچرار :- ۱۹۳۱ء تا ۱۹۴۴ء
ڈاکٹریٹ (از جرمنی) ۱۹۳۶ء — رکن سروسز سلیکشن بورڈ تا ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۶ء
(رائل انڈین آرمی) ۱۹۴۶ء — لفٹننٹ کرنل، چیف ایجوکیشن آفیسر (پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول) ۱۹۴۷ء — افسر تعلیمات
تا ۱۹۵۱ء — چیف انسٹرکٹر آرمی اسکول (کوہ مری) ۱۹۵۲-۵۱ء — جامعہ کراچی ۱۹۶۷-۵۲ء

فہرست

سید امیرالدین قدوائی (علیگ)

ایڈووکیٹ، سپریم کورٹ (لاہور)

محمود بھائی

پروفیسر، ڈاکٹر، لیفٹننٹ کرنل ایم۔ ایم۔ احمدؒ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) پی ایچ۔ ڈی بالقابہٗ طالب علمی میں بھی شانِ ولایت سے مفتخر تھے۔ سنجیدہ، کم سخن، ہنس مکھ، خوش گفتار، شائستہ، باسلیقہ، پر وقار و مہذب ———— یعنی دین داری کی تمام رحمت آرا خوبیوں سے متصف ———— اور ———— وجودی طور پر اپنے متوازن کردار میں رحمت اللعالمینی کی علم برداری کے معلن و داعی۔

وہ ہمیشہ ہر دل عزیز اور مغزز رہے۔ میں نے کبھی ان کی زبان سے کسی کے متعلق بدخواہی کے کلمات نہیں سُنے اور بہی خواہی میں کسی سے ان کو پیچھے نہیں پایا۔ اساتذہ اور ساتھی سب ان کی قدر کرتے تھے۔ خط ان کا بڑا اچھا تھا۔ تحریر بڑی دل پذیر ہوتی اور تقریر دلیسی ہی شستہ اور مؤثر ———— جب وہ استاد بنے، تب بھی اپنے سابق اساتذہ کا ویسا ہی ادب کرتے رہے جیسا کہ پہلے کرتے تھے اور ساتھیوں سے وہی اخلاص رہا، جو پہلے تھا اور شاگردوں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ شفقت کا برتاؤ کیا جو اُن کے ساتھ ہوا ہوگا۔

میرے ان سے دو خاص رشتے تھے، ایک تو تھا روحانی، حضرت مولانا سلیمان اشرف صاحب رح کی شاگردی کا اور دوسرا فلسفہ میں ہم فکری کا، جو حضرت استادِ محترم قبلہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب علیہ الرحمۃ کی غیر معمولی شخصیت کے ساتھ، سعادت مندانہ نسبت کے باعث قائم ہوا۔ حضرت مولانا پروفیسر سید سلیمان اشرف صاحب قبلہ رح بڑے جیّد عالم اور مُرتاض دُرویش تھے۔ وہ اپنی طرف سے تفسیر کا درس مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی مسجد میں دیا کرتے تھے اور جو لوگ اُس میں شرکت کرتے تھے، صرف اُنہی کو شاگرد تسلیم کرتے تھے۔ وہ فیض کا دریا تھے جس نے حسبِ ظرف جو کچھ ان سے حاصل کر لیا، اُس کی برکت اُسی نے نہیں، بلکہ دنیا نے بھی دیکھی اور اُس سے نفع پایا ——— یہ دونوں اساتذہ **محمود بھائی** رح کو مانتے تھے۔

ہم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو "بھائی" کہتے تھے اور اعلیٰ روحانی مراتب سے قبل ——— صرف علیگرین کی حیثیت سے بھی ——— اُن کی منزلت ایسی تھی کہ دوسرے کو نصیب ہونا باعث فخر و مباہات ہو گا! افضال بھائی (ڈاکٹر سید محمد افضال حسین قادری، رئیس کلیۂ سائنس، جامعۂ کراچی) اور وہ بہت زیادہ قریب تھے حتیٰ کہ ایک دوسرے کا جُزِ التصور، اُس دورِ عمل میں دشوار تھا جب یہ ہندوستان اور بیرونی ممالک میں احیائے اسلام کے لئے قیامِ پاکستان کی سعی میں گرداں تھے۔

میں عمر اور کلاس میں سینیر ہونے کی وجہ سے علی گڑھ کے ضابطہ کی رُو سے دونوں کا بڑا تھا اور یہی رکھ رکھاؤ محمود بھائی اور افضال بھائی کا ہمیشہ رہا۔

اس دور میں علی گڑھ کا ایسے عظیم المرتبت فرزندانِ اسلام کی تربیت و پرداخت سے دنیا پر جو احسان ہے، اس کے ایک نشان کا "وجودِ پاکستان" خود حامل ہے اور اس کا تذکرہ اس لئے واجب ہے کہ نہ تو مرحوم کو خود ستائی کسی پہلو سے گوارہ

تھی، نہ افضال بھائی ہی ان اہم باتوں کا ذکر کریں گے جن میں بار بار اُن کا نام آئے۔

پاکستان کا نام چودھری رحمت علی صاحب کی تصنیف ہے اور ان کی خدمات کے اعتراف کی طرف جب توجہ ہو گی تو ـــــــــــ تو لوگ اِن مساعی کی تفصیلات بھول چکے ہوں گے۔ جن کے جاننے والوں میں ایک عالی مقام و جامع صفات محمود بھائی علیہ الرحمۃ تھے اور دوسرے مجسمۂ صدق و عمل ڈاکٹر افضال حسین قادری صاحب ہیں۔ خدا ان کا فیض جاری رکھے آمین ـــــــــــ چودھری صاحب نے پاکستان کے لئے پنجاب کی پ۔ افغانستان کا الف ۔ کشمیر کا ک ۔ بلوچستان کے نام کا آخری حصّہ یعنی تان لے کر اُسے مرتب کیا تھا اور یہ شاندار وباعزّت نام، ان کی محبوب ترین یادگار ہے۔

محمود بھائیؒ اور افضال بھائی نے انگلستان میں چودھری رحمت علی صاحب کے ساتھ کام کیا تھا اور ۱۹۳۵ء میں..... انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے ضمیمہ میں پاکستان پر نوٹ چھپوانے کا اہتمام اور اس کے مصارف میں بھی دونو صاحبان نے شرکت فرمائی تھی۔

اور یہ دونوں اکابر اُن کے ایسے رفقاء میں سے تھے کہ شاید انہی حضرات کی کسی تزہیم کو چودھری رحمت علی صاحب نے اپنی تجویز میں گوارہ کیا ہو۔ کیونکہ مدتوں کی مسلسل جدوجہد اور شبانہ روز کے انہماک، تحریروں، تقریروں، تدبیروں کے وفور نے خود ان کو بھی متاثر کیا تھا اور کوئی آدمی اپنے مقصد پر اس شدت سے قائم ہوئے بغیر، کوئی نتیجہ پیدا کر بھی نہیں سکتا ہے۔

چودھری رحمت علی صاحب محمود بھائیؒ اور افضال بھائی سے ملنے کو خود علی گڑھ بھی آئے تھے اور اُن سے میری ملاقات وہیں ہوئی تھی جب

کہ وہ محمود بھائی رح کے پاس مقیم تھے - ان کی باہم خط و کتابت رہتی تھی اور مشاورت بھی -

علی گڑھ میں اسلامی امور پر فکر و عمل کے لئے ایک مجلس اسلامیات استاذِ محترم حضرت قبلہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن علیہ الرحمتہ کی صدارت میں قائم تھی جس کے محمود بھائی رح، افضال بھائی اور برہان بھائی (ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ایم-اے پی ایچ-ڈی (علیگ) خاص ارکان تھے - قیام پاکستان کے بعد برہان بھائی کی صدارت میں، مجلس اسلامیات ہی کے خطوط پر لاہور میں مجلسِ فکر و نظر قائم ہوئی تھی - ______ دعاء ہے کہ محمود بھائی رح کے رفقاء، اور معتقدین اس کارِ عظیم کو اُن کی یادگار کے لئے پھر قائم کریں -

مجلس اسلامیات علی گڑھ کے حلقۂ عمل کو محمود بھائی رح اور افضال بھائی کی یوروپ سے تکمیلِ تعلیم کے بعد علی گڑھ واپسی پر، مزید وسعت کی ضرورت ہوئی - کیونکہ محض اصول اور تدابیر کا بیان، بغیر کسی قابلِ عمل اسکیم اور واضح مقصد کے جو ولولہ پیدا کرتا ہے، وہ غلط راہ پر بھی لے جاتا ہے - اس لئے اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی فلاح کے لئے سعی کی غرض سے "مجلس اسلامیات" کے تحت اسلامی جماعت کی تازہ تشکیل ہوئی جسے (بعد میں بننے والی) "جماعتِ اسلامی" سے اعتقادی یا اصولی امور میں کوئی تعلق نہیں تھا - بلکہ یہ علی گڑھ تحریک کا واضح تر نام تھا اور علیگیرین روایات کے مطابق شیعہ سنّی سب اس میں شریک تھے اور حضرت استاذِ محترم کی دعاؤں اور ہدایات کے فیض سے ہر کام، جو ناممکن معلوم ہوتا تھا، اتنی خوبی سے ہو سکا کہ مؤرخین کو یقین کرنا دشوار ہو گا -

۱۹۲۴ء میں قبلہ حلیم صاحب مدفیوضہ، کے ایک شاگرد (بعدہ، ڈاکٹر پروفیسر) کنور محمد اشرف کے ساتھ مل کر ہم عقیدہ اور حوصلہ مند نوجوانوں نے علیگڑھ میں عملی و دینی احساس کے تحت اسلامی جماعت بنائی تھی - لیکن اس وقت نہ تو وسعت کے ساتھ کوئی کام ممکن تھا

اور نہ کوئی واضح اسکیم تھی۔ البتہ "دلش نالد چرا نالد نداند" قسم کی وجدانی حالت کا یہ اثر تھا کہ منفیاتی کی جگہ تعمیری سعی کا ہر شخص خواہاں تھا ______ اور قوم کی چھاتی پر سوار، بے کردار و مفروضہ لیڈروں سے بے زار تھا۔ لیکن ان کی گرفت ایسی نہ تھی کہ تحریکِ خلافت کے خفیف اور اوپری جھٹکے سے ڈھیلی پڑتی۔ خود قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس کی جاں فشاری قائم رہی، کیونکہ عام بیداری اور تنظیم نہ ہو سکی۔

ہم لوگوں کا خاص تعلق مولانا شوکت علی صاحب سے تھا۔ کیونکہ وہ علی گڑھ اسپرٹ کا متعدی مجسمہ تھے۔ مولانا آزاد سبحانی اس عہد کے بڑے گہرے اور ذی علم آدمیوں میں تھے اور مولانا حسرت موہانی بے حد خطرناک شمار ہوتے تھے۔ خود مدعیانِ قیادتِ ملی ان سے لرزتے تھے۔ حکومتِ ہند تو خیر ترساں تھی ہی، لیکن ہمارے مؤدبانہ تعلقات روایاتِ علیگڑھ کے مطابق ملک میں ہر قسم کے کارکنوں اور لیڈروں سے جو قائم ہو گئے تھے، وہ رہے اور اُن کے باعث علیگڑھ کی خدمت میں بھی آسانیاں ہوئیں اور تبلیغِ مقاصد میں بھی آگے چل کر پاکستان اسکیم کی تائید میں بھی اس سے بڑی مدد ملی۔

مولانا شوکت علی صاحب ۱۹۲۰ء سے علی گڑھ میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال کے اعلانِ استردادِ خلافتِ اسلامیہ کے بعد وہ طلباء جن کو علی گڑھ عزیز تھا، مگر خدمتِ اسلام کے لئے خلافت کمیٹی کی دعوت پر باہر آکر شریکِ عمل تھے۔ اس حادثہ کے بعد واپس آگئے ان میں سے جنہوں نے مؤثر طریقہ پر کام کرنا چاہا، انھوں نے ہم رنگی کی تدبیر اختیار کی۔ جیسے آجکل مغربی پاکستان کے ناظمِ اوقاف مسٹر مسعود نے بعدہٗ بھیلوں کی اصلاح کے لئے تدبیر کی تھی اور وہاں آج سیکڑوں شائستہ، پابندِ صوم و صلوٰۃ آدمی، ان کی لنگوٹی کے فیض سے شعورِ جامہ داری پر قائم ہیں۔

علی گڑھ لوٹنے والے لوگ، علی گڑھ لائف کی موجوں میں سب کے ساتھ مدغم ہو کر نئی اور غلط باتوں کی اصلاح کا باعث ہوئے۔

غریب طلباء کے لئے جو علیٰحدہ کم خرچ ہوسٹل قائم کیا گیا، وہ بات علیگڑھ کی اعلیٰ روایات کے منافی تھی۔ ان لوگوں کی کوشش سے یہ تخصیص ختم ہوئی اور کم فیس دے سکنے والے طلباء حسبِ طریق، بلاامتیاز سب کے ساتھ برابری سے رہنے لگے۔ کم رُتبہ لوگوں کے عروج کے باعث بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ——— اُن سے اور بے دینی سے طلبا کو بلند رکھنے میں برابر سعی جاری رہی، جس کی اہم یادگاروں میں، اُن اکابر کی تقاریر، تحریرات اور دوسرے کام ہیں جو ہمارے بلُائے سے وہاں آئے اور علی گڑھ کے طرفدار ہو گئے۔

اُس وقت ایک اہم ضرورت یہ تھی کہ "احیائے اسلام"، کی تحریکوں سے مسلمانانِ ہند کی مساعی کو ہم آہنگ کیا جائے۔ اس کے لئے ہر قسم کی تدبیریں کی گئیں

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں رح نے بہ حیثیت وائس چانسلر تحریک علیگڑھ کی جوبلی منانے کا قصد کیا، تو، ہم لوگوں نے، بلامعاوضہ خدمات پیش کیں ——— اس موقع پر علی برادران کے تشریف لانے سے طلباء پر اچھا اثر ہوا۔

اشرف صاحب کا یونین کی صدارت (وائس پریسیڈنٹ) کے لئے انتخاب ہونے سے اسلامی پارٹی کا وقار مسلمہ ہوچکا تھا جوبلی کے موقع پر، تمام حصصِ ہند سے آنے والے "طلبائے قدیم (OLD BOYS) اور دیگر اکابر پر اُن کی تقریروں اور تمام طلباء کے عمل کا بڑا اچھا اثر ہوا۔

میں اُس وقت آنریری پبلسٹی سیکریٹری اور یونی ورسٹی میگزین کے حصۂ انگریزی کا جوائنٹ ایڈیٹر تھا۔

مقصدِ اعلیٰ کی طرف اکابر کو متوجہ کرنے کے لئے ہم لوگ جو کچھ کر سکتے تھے، وہ بہت کم تھا۔ مگر علی گڑھ کی زندگی کا عمومی انداز اچھا ہونا شروع ہو گیا تھا ———

اور، محمود بھائی علیہ الرحمتہ جب یونین کے سکریٹری منتخب ہوئے تو پوری طاقت

اس پارٹی کے پاس بھی جو اسلامی نشان کی علم بردار تھی۔

اُسی زمانے میں غیب سے وہ اہم صورت پیش آئی جس کے بغیر یہ دن، مسلمانانِ ہند کو نصیب نہ ہوتا کیونکہ مسلمانوں کی نہ تو جداگانہ تنظیم تھی اور نہ قیادت ۔ "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے جھوٹے نعرے تھے اور ہمارے تمام لیڈر جُداگانہ قومی وجود کے خلاف تھے اور کہیں بھی پورے حقوق ہمیں حاصل نہیں تھے ۔ وطنی قومیت پر زور تھا ۔ اِسلام کو ایک جداگانہ کلچر یا قومیت کا اساس، تسلیم نہ کرنے والے، ہماری چھاتیوں پر سوار تھے ۔

کانگریس نے حتمی مطالبہ کی صورت میں ایک دستور تیار کرنے کے لئے مسٹر موتی لال نہرو کے نام سے نہرو کمیٹی بنائی ۔ اُس کا آخری جلسہ لکھنؤ میں ہوا ۔ مولانا محمد علی انگلستان میں زیر علاج تھے لیکن بڑی تلخ و تند تحریریں، اس روش کے خلاف، ان کی آتی رہتی تھیں اور مولانا کا یہ سارا غصّہ اُن مسلمانوں کے خلاف تھا جو ہندوؤں کے اُس امتیازی رویّہ سے چشم پوشی کر رہے تھے کہ اُن کا ایک مضبوط فعّال گروہ، کانگریس کے باہر رہ کر، مگر حکومت سے مل کر جن باتوں کا مطالبہ کرتا تھا، دوسرا گروہ وہی مطالبہ، کانگریس کے اندر رہ کر کرتا تھا ۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کے پاس نہ تو تنظیم تھی اور نہ مطالبہ ہی متفقہ تھا ۔ یہ کمی "لیڈرانہ سطح" پر ہمیشہ رہی تا اینکہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے جناح کے ۱۴ نکات آگے بڑھائے گئے ۔

نجی طور پر جتنی تحریکیں چلیں، ان میں چودھری رحمت علی صاحب کی تحریک پاکستان اُن کی جرأت کے باعث نمایاں ہوئی ۔

حضرت مولانا محمد علی کی طبیعت میں زور ہمیشہ سے تھا ۔ مگر علالت کے باعث مزاجی سطح پر، اب اور شدت اختیار کر گیا تھا ۔ لیکن تمام نوجوانوں کے دل اُنہی کے ساتھ دھڑکتے تھے ۔ انگریزوں کے غلام، ہندوؤں کے زرخرید یا ذہنی طور پر درماندہ لوگوں کا

"رہنمایانِ ملّت"، ہونا ایک مستقل سانحہ تھا اور اس کا مداوا، بغیر پُرحذر اور باحتیاط سعی کے ممکن نہیں تھا۔

کچھ لوگ انگریز راج سے عاجز ہونے کے باعث، اُس کے ہر مخالف کا ساتھ، بلا شرط، دینا چاہتے تھے۔ کچھ عقیدتاً اس مُوقف پر تھے۔ کچھ لوگ خود مُسلم لیڈرشپ سے غیر مطمئن یا خفا ہونے کی وجہ سے ٹوڈیوں یا ہوا پرستوں کے ساتھ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس طرح جو بھاری اکثریت مرحوم راجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے نمایاں لوگوں کے اور نہرو کمیٹی رپورٹ کے حق میں تھی، اُس سے علی برادران واقف نہ تھے۔

مولانا شوکت علی صاحب علی گڑھ میں اپنی عظیم جسمانیت، قد آوری اور مولانا محمد علی صاحب کے بڑے بھائی ہونے اور دیگر عظمتوں کے باعث BIG BROTHER (بگ برادر) یعنی "بڑے بھائی" کہلاتے تھے۔ وہ نہایت خوش مزاج، وسیع القلب اور دردمند شخص تھے وہ جس قدر عموماً نرم رَو، آہستگی پسند اور متحمل مزاج تھے، اسی قدر کسی امر کا فیصلہ کرنے کے بعد اُس پر، پوری شدّت سے قائم رہنے والے اور طوفانی زور کے ساتھ کام کرنیوالے تھے،

نہرو کمیٹی رپورٹ پر جلسہ میں مسلمانوں کے حقوق سے بہر معنی قطعِ نظر کیا گیا اور صرف مولانا شوکت اور مولانا حسرت موہانی اپنے اپنے طریقوں پر اُس کے مخالف رہے۔ اس موقع پر راقم الحروف اُن بزرگوں کے ہمراہ تھا۔ ان اکابر سے میری نیازمندی قدیم تھی اور جو کچھ عرض کرتا تھا، اُس پر، راقم کے حسب دل خواہ توجہ بھی فرماتے تھے۔

میں جُداگانہ مُسلم تنظیم کا قائل اور مُسلم جمیعتہ طلباءِ ہند کی جب اجمیر شریف میں بناء ڈالی گئی تو اُس کا مُوید تھا کہ ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کی تنظیم قطعی جداگانہ ہو۔ ان اکابر سے بھی بارہا میں اپنی اسکیم پر تبادلۂ خیال کر چکا تھا۔ اجمیر شریف کے جلسے میں، میں نے مناسب

الفاظ کے اضافے کے ساتھ اپنے موقف کو دُہرایا کہ

علیگیرین آپ کا ہر جگہ ساتھ دیں گے

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — میں "تحریکِ خلافت" میں بھی اُن کے ساتھ رہ چکا تھا اور جب علی گڑھ واپس آگیا، تب بھی اُن سے مؤدبانہ تعلقات قائم رکھے تھے۔ اس موقع کو میں نے ضائع نہیں کیا اور "علی گڑھ تشریف لانے اور جداگانہ تنظیم" دونوں باتوں پر اُن کو راضی کرلیا — ہر چند کہ ہَوا شدید مخالف اور فضا ناسازگار تھی کیونکہ، خود مسلمان لیڈروں کی، حکومت کی نظروں میں مقبولیت اور ہندوؤں میں عزّت کی شرط، صرف یہی تھی کہ مسلمان منظم نہ ہونے پائیں اور خطابات و عطیّات کے لئے جو کچھ بھی وہ کرتے رہے، "انگریز کے لئے فلسطین کی تسخیر" اور "تقسیمِ حقوق" اُس کے شاہدانِ عادل ہیں — لیکن لکھنؤ کے واقعہ سے مولانا شوکت علی کو چوٹ کچھ ایسی لگی کہ انھوں نے وہیں سے آغازِ سعی کردیا اور لکھنؤ یونی ورسٹی کے ہوسٹل میں جہاں مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں لیڈروں کی تقاریر کا پروگرام تھا، مولانا نے بڑے مؤثر انداز میں مسلمانوں سے عادلانہ برتاؤ کی ضرورت اور خود مسلمانوں کی تنظیم کو آزادیٔ ہند کے لئے کوشش کرنے کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر ولولہ انگیز تقریر کی۔ غیر مسلم حاضرین مولانا کے دلائل سے لاجواب اور مسلمان متاثر ہوگئے۔

مجھے مولانا شوکت علی کا لفٹننٹ کہا جاتا تھا — دَنی مزاج اس سے حسد کرتے تھے اور علیگیرین ساتھی "جنرل"، کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ اس جلسے میں بھی مولانا صاحب نے کہا کہ میں اور میرا لفٹننٹ امیر الدین قدوائی، اس ملک اور بنی نوع کی بہترین خدمت پر کمربستہ ہوچکے ہیں۔ ہم نے طے کرلیا ہے تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں، تاکہ یکجہت غیر مسلموں سے منصفانہ سمجھوتہ اور جنگ آزادی میں یقینی کامیابی ممکن ہوسکے، ورنہ ہمارے نوجوان اور ہماری آئندہ نسلیں ہمیں کبھی معاف نہ کریں گے اور انھیں معاف کرنا بھی نہیں چاہیئے اگر ہم اُن کو اِسی "غلامی در غلامی" میں چھوڑ دیں (دو غیروں کا)

غلام مجتبیٰ خاں صاحب اُن دنوں، اُسی ہوسٹل میں تھے۔ وہ اکثر اس واقعہ کو یاد کرتے ہیں کہ کس طرح مسلمانوں کی تقدیر نے بہتری کی طرف پلٹا کھایا تھا۔

میں نے مولانا رح کو خوشامد کرکے علی گڑھ چلنے پر راضی کرنے کا یہ موقع ضائع نہیں کیا تھا اور جب وہ حسبِ وعدہ تشریف لائے تو یونین میں اُن کے استقبال میں جب یہ آخری جملہ کہا گیا کہ

BIG BROTHER WELCOME HOME

(بڑے بھائی گھر لوٹ آنا مبارک) تو وہ "بڑے بھائی" کی مقدس اور شاندار ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔ محمود بھائی رح اس وقت یونین کے سکریٹری تھے۔ اُن کی خوش تدبیری سے، یہ سب کچھ، آگے چل کر، طلباء میں اسلامی جذبات کے وفور اور پاکستان کی مجاہدانہ تائید کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

"بڑے بھائی" نے، میری لکھنؤ کی سعادتمندانہ معروضات کا انگریزی میں یوں تذکرہ فرمایا تھا:-

WHEN I HAD LOST ALL COURAGE THIS LEAN THIN LIEUTENANT OF MINE PUT FIRE IN TO ME.

یہ اُن کا حسنِ بیان تھا، ورنہ وہ "کُل ہمت" کا ختم ہوجانا تو کجا، ان کی ہمت، ہر دشواری پر پہلے سے زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی تھی۔ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا، اُس کا یہ اعتراف، اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔ اپنے علی گڑھ آنے کی توضیح انھوں نے اسی سلسلے میں یوں کی تھی:-

IT WAS A MOUSE DRAGING A LION.

علی گڑھ میں اس پر بڑا فخر کیا گیا کہ وہ علیگیرین اکابر مولانا حسرت موہانی رح اور مولانا شوکت رح نے قوم کی بات رکھ لی۔

محمود بھائی، میری اس خدمت سے بہت ہی مسرور تھے اور اس
واقعہ کی باقاعدہ خوشی منائی گئی، جس نے مسلمانوں کی تنظیم کی راہ نکالی اور
طلباء میں آگے دیکھنے کی ہمت کے امکانات پیدا کئے — کیونکہ مسلم طلباء
کے مقابلے میں ہندوؤں میں اُن کے لیڈروں کی پُرخرم سعی سے بہت بیداری تھی
اور اُن کا جو آدمی، سرکاری ملازمت میں آتا تھا ان کے لئے تقویت کا ذریعہ
بنتا تھا۔ جب کہ ہمارا نوجوان، صرف "صاحب" کا غلام، اسلام کا ناقد
اور مسلمانوں کو حقیر کہنے والا ہوتا تھا۔

علی گڑھ میں بھی اس کی ضرورت تھی کہ نوجوانوں میں وسعتِ حوصلہ کو ترقی دی جائے۔
اور، یہ کارِ عظیم، محمود بھائی کے سپرد کیا گیا تھا۔ محمود بھائی اِس تحریک
کو نہایت سلیقہ سے چلاتے رہے — تاآں کہ سر راس مسعود (جن کا آنریری سکریٹری
کچھ دن کے لئے میں اسی مقصد سے ہو گیا تھا) وائس چانسلری سے سبک دوش ہو کر، ملازمت
پر بھوپال چلے گئے، مگر محمود بھائی سرگرم ہی رہے اور اُن کے ہم فکر و رُفقاء اس کئی برس
کی جدوجہد میں بہت اہم نتائج کا باعث ہو سکے۔

○ — کامیابی کی اس رفتارِ ترقی کا سبب یہ تھا کہ محمود بھائی
اور ہم سب نے تصادم سے احتیاط کا خاص اہتمام رکھا تھا۔

محمود بھائی، مزید تعلیم کے لئے جب یورپ گئے تو وہاں بھی مسلمانوں کی فوز و فلاح
کی تدابیر سے غافل نہیں رہے، اُن کے اور افضال بھائی کے جو خطوط آتے تھے، استاذِ محترم
حضرت قبلہ علامہ ڈاکٹر سید ظفر الحسن علیہ الرحمتہ اُن سے بہت خوش رہتے تھے اور پاکستان
تحریک میں ان کی دلچسپی سے تو بہت ہی مسرور تھے۔

محمود بھائی اور افضال بھائی کی یورپ سے واپسی پر اسلامی جماعت اور
اُس کے تحت ۲ دو کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک میں استاذِ محترم علیہ الرحمتہ کی صدارت میں

ان دو اکابر کے ساتھ راجہ صاحب محمود آباد اور مولانا ابن حسن جارچوی کو رکھا گیا، اور دوسری کمیٹی، مسلم لیگ میں اس خیال کو مقبول بنانے اور تنظیم کی دیگر مساعی و تدابیر کے لئے بنائی گئی۔ جس میں جناب صدر کے ساتھ آنریبل مسٹر عبد العزیز آف پٹنہ، مولانا سبحان اللہ مرحوم، مولانا آزاد سبحانی، نواب بہادر یار جنگ، نواب اسماعیل خان صاحب، علامہ راغب احسن اور راقم الحروف کو مقرر کیا گیا ——————— علامہ راغب احسن صاحب بہت سرگرم اور دلاور مجاہدین پاکستان میں ہیں۔

ڈسپلن کے باعث تمام ناپسندیدہ لوگوں کی مداخلت سے یہ ناعل و غش محفوظ رکھ کر، اس کام کو اتنی خوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچانا یوں ممکن ہوا کہ صدر محترم کی رہبری میں محمود بھائی اور انفصال جیسے دو اکابر اپنی پوری دانش مندی سے سرگرم عمل تھے۔ یہی کرتا دھرتا تھے۔ میرا نام خواہ مخواہ ہر جگہ تھا[۱]

محمود بھائی کے ایک فدائی ڈاکٹر ذکی الدین مرحوم تھے جن کو خدا نے متعدی اخلاص عطا فرمایا تھا اور ان کی وجہ سے بہادر یار جنگ مرحوم اور

---

[۱] - جس طرح تحریک پاکستان علی گڑھ کی ممنون احسان ہے اسی طرح علیگ برادران حضرت مولینا سید امیر الدین قدوائی کے ممنون رہیں گے کہ ان کی ولولہ انگیزی، دلسوزی اور عشق رسولؐ نے ہر چھوٹے بڑے کی رگوں کے خون کو گرم کر رکھا تھا

اس حقیقت سے آگاہ لوگوں کی کمی آج بھی نہیں ہے کہ جناب امیر الدین قدوائی (علیگ) کی شخصیت، پاکستان کے حصول کے لئے کام کرنے والوں کے لئے خون گرم کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس کام کے لئے سب کہدیں کہ یہ نہیں ہو سکتا، وہ اس کے لئے جان لڑا دیا کرتے تھے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس دور میں اگر قدوائی نہ ہوتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلانے کی کسی کو مجال نہیں ہے۔ (سید رفیق عزیزی)

دوسرے نمایاں لوگ ہمارے ساتھ ہوئے تھے ۔ مرحوم نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کے اثرات بھی ہمیں حاصل تھے

حضرت علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال نے "پاکستان اسکیم" سے لاتعلقی اختیار کرلی تھی۔ اور اس بات کے ثبوت کے لئے علامہ اقبال کا خط، چودھری رحمت علی صاحب نے شائع کردیا تھا۔ چودھری صاحب کی اس اسکیم سے علامہ اقبال کی لاتعلقی کے اظہار کا سبب غالباً یہ ہو کہ اُس میں افغانستان کو بھی شامل کیا گیا تھا اور اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں ۔ (اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بعض پیدا ہو چکی اور قائم ہو گئی ہوں) چودھری صاحب کی اس اسکیم میں جب علی گڑھ میں ترمیمات کی گئیں ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ افغانستان کو اس اسکیم سے خارج کردیا گیا ۔ کیونکہ افغانستان پہلے ہی سے آزاد اور مسلم ریاست تھا۔

اس کے علاوہ جب اسکیم کی تازہ تدوین ہوئی تو اُس میں مسلمانوں کے تمام مطالبات اور مفادات کی پوری آئینہ داری کا اہتمام کیا گیا اور اس کی عبارت و بیان کو ہر قسم کی غیر شایاں باتوں سے پاک اور منصفانہ دلائل سے مزین کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دیگر اکابر نے بھی اس کا ذکر، اہمیت کے ساتھ کیا تھا (اور، اس خیال (پاکستان) کو ہر سطح پر مقبول بنانے میں اُس کا خاص حصہ تھا ۔

سیف الملت علامہ راغب احسن کلکتہ میں ہمارے زبردست اور زوردار ساتھی تھے جن کی وجہ سے پورے مشرقی خطہ میں پاکستان کا مطالبہ عام اور قائم ہوا ۔ وہ بعض معاملات میں دوسرے چودھری رحمت علی ہیں ۔

۱۹۳۵ء میں مولانا شوکت علی علیہ الرحمۃ کی مسلم لیگ میں شرکت سے، خود اس جماعت کی نوعیت بدل گئی تھی ۔ اور ۱۹۳۷ء کے "لکھنؤ اجلاس" کے بعد مسلمانوں میں مطالبۂ پاکستان کی طرف توجہ بڑھنا شروع ہوئی ۔ کیونکہ 'آل انڈیا مسلم کانفرنس

نے جس سے جناح کے چودہ نکات ابھرے تھے۔ [1] اور مولوی شفیع داؤدی جس کے ورکنگ سکریٹری مولانا مظہر الدین پبلسٹی سکریٹری، اور میں راقم الحروف آنریری سکریٹری تھا۔ میں مسلم لیگ میں شامل ہو گیا تھا۔ اُن دنوں میں آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ کا سکریٹری جنرل تھا اس جماعت کے بانیوں میں سے ایک علامہ راغب احسن صاحب بھی تھے۔ ہماری یہ جماعت بھی مسلم لیگ کی تائید میں شامل ہو گئی اور دو اہم ذرائع جن میں ہماری اسلامی جماعت (مودودی صاحب والی جماعت اسلامی نہیں) کا ہاتھ تھا۔ اس طرح مسلم لیگ کی تقویت اور مقصد جماعت کی استحکامی صورت کا باعث ہوئے۔

یہ وہ وقت تھا کہ فرضی لیڈر ذاتی مفادات کو بنیے جنرلوں کی طرح تول رہے تھے —— لیکن محمود بھائی اور افضال بھائی کی تدبیر کاریہ تھی کہ ہر دیانت دار آدمی حصولِ پاکستان کو اپنا ذاتی مقصد بنائے —— تاکہ برطانوی یا دیگر مفاد کے ایجنٹوں کی مداخلت سے بہت کچھ حفاظت ہو سکے اور مسلم لیگ —— اس کو اپنا پروگرام بنالے تاکہ مسلم لیگ پر بے عملی کا جو الزام ہے، وہ ختم ہو جائے اور مسلم لیگ کا وجود چند خوش حالوں تک محدود ہونے کی بجائے مقاصد کے استحکام کے لئے ایک عوامی جماعت ہو جائے۔

---

[1] - یہ ایک طویل داستان ہے۔ علامہ اقبال کی لاتعلقی کے اظہار کے بعد، وہ سب کچھ جس پر یہ سب حضرات محدود تھے وہ "جناح" کے ۱۴ نکات ہی تھے۔ قائدِ اعظم سے "علی گڑھ اسکیم" بڑی احتیاط سے ۱۹۳۹ء میں منظور کرائی گئی تھی۔ (سید رفیق عزیزی)

اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں، مناسب وقت پر زحمت نہیں ہوئی ۔ کیونکہ تمام برصغیر ہند میں رب کی یہی رائے تھی ۔

"اسلامی جماعت" میں اصول یہ تھا جس شخص کو جو کام سپرد ہو، وہ اپنے صواب دید کے مطابق سعی کرے ۔

جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے مقابلہ میں مسلم لیگ کے پاس نہ تو رضا کار تھے اور نہ قائد اعظم کی ہدایات پر اس بارے میں عمل ہی ہو رہا تھا ــــ اس لئے مولانا سبحان اللہ صاحب قبلہ مشرقی یو۔ پی میں خاکساروں کے ناظم اعلیٰ ہو گئے اور سب جانتے ہیں کہ میں نے اس تجویز کی پر زور تائید کی کہ یو۔ پی مسلم لیگ میں ایک علیگیرین کو جنرل سکریٹری مقرر کیا جائے ــــــــــــــ خداوند کریم کا شکر ہے کہ ان ہر دو اقدامات کا اثر وہی مُترتب ہوا، جو مطلوب تھا ۔

فروری ۱۹۳۹ء کی بات ہے ۔ گورکھپور میں "یو۔ پی مسلم لیگ کانفرنس" کے موقع پر میں بھی حضرت مولانا سبحان اللہ صاحب کا مہمان تھا ــــــــــــ وہیں پٹنہ والے آنریبل عبدالعزیز صاحب (جو محمود بھائی کی وجہ سے) مجھ پر بہت ہی مہربان تھے) اور نواب اسمٰعیل خانصاحب اور راجہ محمود آباد اور دیگر اکابر بھی مقیم تھے ــــــ اس موقع پر بھی پاکستان کے مؤیدین، دوسروں کو ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوئے اور یہ قرار پایا کہ یہ اسکیم (علی گڑھ اسکیم) مسلم لیگ میں منظور کرائی جائے ۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں بمقام میرٹھ (یو۔ پی) مسلم لیگ کے جلسہ میں قائد اعظم شرکت کرنے والے تھے ۔ نواب اسمٰعیل خاں صاحب نے مجھے اجازت دی کہ علی گڑھ پاکستان کمیٹی (اسلامی جماعت) کے ارکان میں سے جو بھی اس غرض سے میرٹھ آئیں، ان کو نواب صاحب کے پاس ٹھہرنے کی دعوت کے خطوط اُن کی طرف سے بھجدوں ۔ چنانچہ وہیں سے ان کے دستخطی خطوط اس غرض سے افضال بھائی کی خدمت میں بھجدیئے گئے

مارچ ۱۹۳۹ء میں محمود بھائی رح اور افضال بھائی نے یہ اسکیم، میرٹھ میں مسٹر جناح کو سمجھائی اور انھوں نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس بابت اپریل ۱۹۳۹ء میں اُس کی تقریر کے لئے، محمود بھائی رح، افضال بھائی اور مجھ کو بُلایا چنانچہ ہم نے بمبئی پہونچ کر یہ خدمت بھی انجام دی جسے قائد اعظم نے بہت پسند کیا۔ چناں چہ ایک سال تک پوری تیاری اور جد وجہد کے بعد نہایت حسن وخوبی سے مارچ ۱۹۴۰ء میں "پاکستان رزولیشن"، قرار دادِ مقاصد کی صورت میں متفقہ طور پر لاھور سیشن میں منظور ہو کر محورِ فکر وسعی بنا اور ۱۹۴۷ء میں صورت پذیر ہوا۔

علی گڑھ کے طلبا، اساتذہ اور اولڈ بوائیز کے صدق وشعور سے قائدِ اعظم اس درجہ متاثر تھے کہ جب لاھور سے علی گڑھ چلنے کے لئے اُن سے، ہم سب کی طرف سے افضال بھائی نے کہا تو انھوں نے فرمایا:۔

YES I MUST GO FOR ZIARAT ——————— (ہاں زیارت کے لئے مجھے جانا ضروری ہے) اور انھوں نے علی گڑھ کی تقریر میں اہتمام کے ساتھ یہ کہا تھا کہ آپ کی پُرخلوص تائید ومعیت کی خوشی سے میں خود کو آج دس برس چھوٹا محسوس کرتا ہوں"۔ آپ سمجھ سکتے ہیں علی گڑھ کے اساتذہ، طلبا اور اولڈ بوائیز کو کتنی خوشی ہوئی ہوگی اس پر۔

اس موقع پر میر العارف قبلہ حلیم صاحب مدظلہ العالی نے مولانا شوکت علی رح کے لفٹنٹ کی حیثیت ہی سے کرایا تھا۔ اولڈ بوائیز کے ظہرانہ (لنچ) میں، میں نے بھی تقریر کی تھی اور میرے ساتھ خاص کرم کی یادگار "پاکستان کے پرچم میں میرے مجوزہ سفید پٹی اور پانچ کرنوں کا ستارہ ہے۔ جو متفقہ نشانات کے مظہر ہیں۔ اس دھاری کی وجہ سے جو مشرق بعید، اتحاد اور عزم متحکم کا اشارہ ہے۔ اور ہلال، ہمیشہ چڑھتے چاند کا اشارہ رہے گا اور پانچ کرنوں کا ستارہ پنجتن پاک اور پانچ ارکان کا مشترک اشارہ پیش کرتا رہے گا۔

اس خیال کو میں نے دہلی میں پہلے میر غلام بھیک نیرنگ صاحب قبلہ کی خدمت میں پیش کیا،

جو قائدِ اعظم کے ساتھ سنٹرل اسمبلی میں ڈپٹی اسپیکر رہے تھے اور محترم شخصیت رکھتے تھے۔ پھر میں نے علامہ راغب احسن صاحب سے کہا کہ آپ قائدِ اعظم کے سامنے پاکستان کے جھنڈے کے بارے میں میری تجویز رکھیں۔ پھر اُن سے پہلے میں خود قائدِ اعظم سے مل لیا اور جھنڈے کے بارے میں اپنی توضیحات اور توجیہات اُن سے عرض کر دیں۔ ایسا کرنا میں نے یوں ضروری جانا کہ یہ بنیادی کام کہیں رہ نہ جائے۔ اس لئے کہ "دو مُرغانِ بادنما" میں یہ سازش ہوئی تھی کہ مسلم لیگ کو ہندوستان میں توڑ کر مسلمانوں کو بے نظام کر کے ذاتی طور پر وزارتیں وغیرہ لے لی جائیں۔ ظاہری حجّت یہ تھی کہ مسلم لیگ کا جھنڈا ہی پاکستان کا جھنڈا ہوگا اور مسلمانانِ ہند اُسے اپنے جلسوں میں لے جائیں گے تو حکومتِ ہند یقیناً تشدد کرے گی جھگڑا ہوگا ـــــ اس حرکت کی بے عقلی ظاہر ہے لیکن شرارت اگر مکمل ہو جاتی تو کوئی ان کا کر بھی کیا لیتا۔

هر چند کہ یہ امر برحق تھا کہ ان "دو مُرغانِ بادنما" میں سے کوئی،
بلکہ سب مل کر بھی مسلمانوں کے سامنے نہ تو اس وقت کھڑے
ہو سکتے تھے، نہ بعد میں ہو سکے
ـــــــ مگر احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ایک ممکن تدبیر
کر لی جائے اور جب پاکستان کا جھنڈا اس طرح سے بامعنیٰ اور باشکوہ
بھی ہو سکتا تھا "تو ایسا کر لینا واجب بھی تھا۔[1]

---

[1] یکم دسمبر ۱۹۵۵ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۵۸ء تک میں، ماہنامہ نقاد، کراچی کا ایڈیٹر رہا۔ ۱۹۵۵ء ۱۹۵۶ء میں، میں نے نقاد کے کسی شمارے میں "پاکستانی پرچم کی توجیہ و توضیح" پر اپنا ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ جس میں یہ واضح کیا تھا کہ اس پرچم کے خالق مولانا امیر الدین قدوائی (علیگ) ہیں اور جھنڈے کی صحیح صورت اور اس کی پیمائش، سفید پٹی، چاند اور تارے کا صحیح رُخ، اس کا توازن اور تناسب بھی بتایا تھا۔ اُس وقت نشتر صاحب، چندریگر صاحب، خواجہ ناظم الدین صاحب سب ہی حیات تھے۔ میں نے سب کو دعوت دی تھی کہ اگر میں نے کوئی بات غلط لکھی ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ پھر

کو احترام رہا ہے اور اس ملک میں اُن کے خاص دوست یہ ۲ دو اکابر رہے۔ جن میں سے ایک کی یاد میں یہ خاص نمبر بڑی عجلت میں نکالا جا رہا ہے ــــ اور، دوسرے کے لئے دل وزبان باعزّت وصحت طویل عمر کی دُعا میں ہم آہنگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو بے نیازی کے ساتھ خدمتِ علم واسلام کی تمام آسانیاں اور فرصت عطا فرمائے اور ہر طرح اپنے انعامات سے نوازے اور محمود بھائیؒ کے مراتب بلند سے بلند تر فرمائے اور اُن کے پسماندگان کو صبرِ جمیل واجرِ جزیل، بہر طور عطا فرمائے۔ اور یہ لوگ اُن کا نام عزّت کے ساتھ چلائیں۔ آمین

۱۹۴۰ء کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک ان دونوں اکابر نے کسی وقت کمر نہیں کھولی۔ خاکساروں کے مسلم لیگ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش اور لیگ کے تحت رضا کاروں کی تنظیم کی ضرورت اور ملتِ مسلمہ کی بہتری کے لئے ہر امر میں دلچسپی وسرگرمی جاری رکھی ـــ لیکن مسلمانوں کی تقدیر میں قتلِ عام اور توہین تھی، اس لئے نہ خاکساروں نے اپنا مقام ومرتبہ پہچانا اور نہ دو مرغانِ باد نما" نے قائدِ اعظم کا حکم ہی مانا۔ ملّت کا درد اور ذمّہ داری کا احساس ان سے ہمیشہ بہت دُور رہا ہے ـ یہودی وزیرِ ہند لارڈ زٹلینڈ سے جنہوں نے تقسیمِ بنگال وپنجاب کی سازش قائدِ اعظم کو لاعلم رکھ کر کی اور ان حصّوں میں بالخصوص، اور سارے ملک میں بالعموم، رضا کاروں کی باضابطہ اور نوجوانوں کی مؤثر تنظیم، محض اس خوف سے نہیں ہونے دی کہ اُن کا اقتدار ختم ہو جائے گا ـــ ان لوگوں نے تبادلۂ آبادی کے تصفیہ کو بھی راز رکھا انہی لوگوں کے سر مظلوموں اور بیکس شہید قائدِ اعظمؒ کا خون بھی ہے، جو دل پر یہ داغ لیکر اٹھے اور جسے لکھنے کی ہمت کوئی مؤرخ نہیں رکھتا۔

پاکستان پر اِن عظیم حادثات کے نفسیاتی اثرات اور ردِّ عمل کی اُلجھنوں سے ہر سطح پر جو دشواریاں حکومت اور تمام باشندوں اور پڑوسی ملکوں کے لئے قائم ہیں، اُن کے حل کی صورت، اُسی فکرِ سلیم، اُسی تحمّل وتدبّر سے ممکن ہوسکتی ہے جو، اِس مملکت کی تشکیل میں بروئے کار تھیں اور جو صرف رحمت اللعالمینؐ کے شیوع اور محمدیّت کے

تفاوات واقعی سے متعلق ہیں۔ کیونکہ فطرتِ انسانی کسی اور چیز سے سازگار نہیں بنائی گئی ہے۔

جب کوئی مقصدِ ملی درپیش ہو اور مجھے خواہ کچھ ہی سہنا پڑے، میں کبھی کسی امر میں کوئی بات راہ میں حائل نہیں ہونے دیتا۔ اس پاکستان کے سلسلے میں بڑی ناگواریاں سہنا پڑیں۔ لیکن اُن کو قیمتی تجربات سمجھ کر شکریہ کے ساتھ گوارہ کیا۔

یہ وہ وقت تھا کہ بترا ایجی ٹیشن لکھنؤ میں ہو رہا تھا اور پنجاب و سرحد اور سندھ سے رضاکار اس غرض سے بھیجے جاتے تھے اور جناح صاحب کی ذات و صفات کے خلاف سب ہی کچھ کہا جاتا تھا خاص کر یہ کہ اسلامی حکومت اسی قیادت میں بن ہی نہیں سکتی۔ اس سے سُنیوں کا بیڑا غرق ہو گا (وغیرہ وغیرہ) ایسے میں پاکستان کے بغیر کوئی چارہ ممکن نہیں تھا۔

محمود بھائی مرحوم کا نسلِ انسانی پر یہ احسان رہے گا کہ انھوں نے سخت صبر آزما حالات میں، اپنے محدود وسائل سے کہیں بڑھ کر اس تحریک میں حصّہ لیا اور انفصال بھائی کے تو کہنے ہی کیا ہیں۔ وہ روح و رواں تھے۔

محمود بھائیؒ کی پاکستانی زندگی، بالکل دینی بلکہ رُوحانی تھی اور یہ اُن کی صداقت کا انعام تھا کہ اس دنیا میں وہ فائز المرامی کے ساتھ رہے اور جسمِ پاک اُن کا مکّہ شریف میں مدفون ہوا۔

ایسی حیات اور ایسی موت اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے جسے بھی نصیب ہو جائے، لائقِ صد احترام ہے۔